© rasailojaraid.com

بحث ونظر

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

مولانا محمد فاروق خاں ایم۔اے

اخلاق کو انسانی زندگی میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تاریخ میں کسی ایسی قوم کی مثال نہیں ملتی جس میں نیکی و بدی کا سرے سے کوئی تصور نہ پایا جاتا رہا ہو۔ جو لوگ جبریت (Determinism) کے قائل ہیں وہ بھی علی الاعلان اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے نزدیک جھوٹ اور سچ میں یا ایمان داری اور مکر و فریب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سچائی، خیر پسندی اور سلامت روی انسان کی مطلوب صفات ہیں۔ انسانی ضمیر کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ ایفائے عہد کے مقابلہ میں مکر و فریب کو، ایثار و قربانی کے مقابلہ میں خود غرضی کو اور جذبۂ اخوت و ہمدردی کے مقابلہ میں بغض و حسد اور ظلم و ستم کو بہتر سمجھنے لگے۔

انسانوں سے کسی خاص قسم کے اخلاق کے مطالبہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ جہاں کوئی ارادہ و اختیار نہ پایا جاتا ہو وہاں کسی اخلاق و کردار کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاق کا تعلق انسان کے ارادہ و اختیار سے ہے۔ انسان کو دنیا میں ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے اس لیے اس کا ایک اخلاقی وجود ہے۔ یہی چیز ہے جو اُسے عام حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔

انسانی افعال و کردار کی کوئی مادی توجیہ ممکن نہیں، شعور کو مادہ کی پیداوار سمجھنا صحیح نہیں۔ بے شعور مادہ کا مطالعہ ایک مادی تحقیق ہے۔ مادی اسباب کے ذریعہ سے شعور کی تشریح کسی طرح نہیں کی جا سکتی۔ میکس پلانک (Max Plank) نے کہا ہے:۔

> "کوئی شخص خواہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو محض علت و معلول کے قانون کے ذریعہ، اپنے شعوری افعال کے فیصلہ کن محرکات کے متعلق کبھی بھی صحیح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے کسی اور قانون یعنی قانونِ اخلاقیات کی ضرورت ہے[1]
انسان کو صاحب ارادہ واختیار قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ نفسِ انسانی کی مستقل حیثیت تسلیم کی جائے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اسے اخلاق و کردار کا حامل قرار دینے کے لیے کوئی وجہ جواز ممکن نہیں ہے۔

اخلاق و کردار کے لیے ارادہ واختیار کی آزادی کے علاوہ ایسے حقیقی، مستقل اور مطلق (Real permanent and absolute) اقدارِ حیات کی بھی ضرورت ہے جو اخلاقی قوانین کا مدار قرار پائیں۔ جن کی قدر و قیمت اضافی اور عارضی نہ ہو بلکہ ان کی قدر و قیمت مستقل اور ذاتی (Intrinsic) نوعیت کی ہو جن کے تحفظ کے لیے آدمی اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہو سکے۔

علاوہ ازیں انسانی زندگی میں کسی اعلیٰ نظام اخلاق کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان کا کوئی ایسا مقصود و منتہا نہ ہو جو مطلق قدر کا حامل ہو، جس کی جانب بڑھنے میں ہم اپنی تمام تر کوششیں صرف کر کے تسکین پا سکیں اور جس تک پہنچنے پر ہماری اپنی تکمیل کا بھی انحصار ہو۔ زندگی کا کوئی بلند مقصود و منشاہی آدمی کو ہر قسم کی گمراہیوں اور تلون و انتشار سے بچا کر فطرت کے صحیح راستے پر لگا سکتا ہے۔ اسی کے حصول کی کوشش انسان کی اصل کامیابی اور اس کی اپنی ذات کی تکمیل کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر ہماری زندگی میں بھی اور خاص طور سے ہماری اندرونی زندگی میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ اوسپنسکی (Ospenskey) نے لکھا ہے :-

> "انسان جب تک اپنے اندرونی تضادات میں وحدت قائم نہ کرلے اُسے اپنے آپ کو "میں" کہنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ اس کے بغیر اس کا اپنا کوئی ارادہ ہی نہیں ہے۔ جو شخص یہ وحدت حاصل کیے بغیر اپنے آپ کو صاحب اختیار و ارادہ سمجھتا ہے تو یہ اس کی غلطی ہے۔ ارادہ نتیجہ ہوا کرتا ہے خواہشات کا۔ جس شخص کی خواہشات ہی مستقل نہ ہوں اس کی حیثیت محض اپنے جذبات اور خارجی تاثرات کے کھلونے کی ہوگی۔ اُسے خبر نہیں ہو سکتی کہ دوسرے ہی سانس میں وہ کیا کہہ دے گا اور کیا کر گزرے ۔ اس کی

---

[1] دیکھئے The Universe in the light of Modern Physics ص٢١

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی کے ہر لمحہ پر اتفاقات کا پردہ پڑا ہوگا"۔ [۱]

زندگی میں داخلی توافق کی بڑی اہمیت ہے۔ داخلی توافق کے بغیر معاشرہ میں بھی کسی توافق اور وحدت کی امید نہیں کی جا سکتی۔ رہا مسئلہ اخلاقی اقدار (Moral values) کے حصول کا تو حقیقت کے علم کے بغیر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ راشڈل (Rashdall) کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے:

"یہ ممکن نہیں کہ حقیقت کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر اخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو یا ہمارے اخلاقی نقطۂ نظر سے ہمارا تصورِ حقیقت متاثر نہ ہوتا ہو"۔

حقیقت سے صرفِ نظر کر کے کسی اعلیٰ اور پائدار نظام اخلاق کے حصول کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مستقل اور مطلق اخلاقی قدروں کے لیے ناگزیر ہے کہ زندگی اپنی کوئی حقیقی غرض و غایت رکھتی ہو۔ اس کائنات کو کسی عظیم مقصد کے تحت وجود بخشا گیا ہو۔ اور کائنات کی تمام چیزیں محض اس مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسباب کی حیثیت رکھتی ہوں۔

پھر اس سے آگے بڑھ کر کسی اعلیٰ اخلاقی نظام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان تسلسلِ حیات پر ایمان رکھتا ہو۔ کیونکہ اگر ہماری زندگی مسلسل اور مستقل نہیں ہے تو مستقل قدروں سے ہمارا ربط و تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر انسانی افراد کا منتہائے خیال محض قریبی مفاد کا حصول ہو تو کبھی بھی ان کی سیرتوں میں توازن پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ ایسے افراد پر مشتمل کوئی معاشرہ مستحکم اور پائدار ہو سکتا ہے۔

میکنزی (Mackenjie) نے اخلاقی مسائل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جب ہم کہتے ہیں کہ اخلاقیات کے مطالعہ کا تعلق ایسے انسانی کردار سے ہے جو حق اور خیر کا حامل ہو تو اس سے ہمارا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اس نقطۂ نظر سے ہوتا ہے کہ ہمارا کردار (Conduct) کسی ایسے منتہا یا آئیڈیل (End or ideal) کے لیے مفید ہوتا ہے جو ہمارے پیش نظر ہو اور اس کا تعلق ان قوانین اور اصولوں سے ہوتا ہے جن کی رہنمائی میں ہمارا کردار اس منتہا کے حصول کے لیے صحیح رخ اختیار کرتا

---

[۱] The new model of Universe p. 132-33

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ یوں تو مختلف مقاصد کے لیے ہم کام کرتے ہیں جیسے مکان کی تعمیر، کتاب کی تصنیف وغیرہ لیکن اخلاقیات میں کردار کا مطالعہ بحیثیت "کُل" (As a whole) کے مطلوب ہے۔ یہ کسی مخصوص قسم کے کردار کا مطالعہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ مختلف مقاصد میں سے کسی ایک خاص سے تعلق نہیں رکھتا جو اس کے پیش نظر ہو بلکہ اس کا تعلق اس بڑے اور آخری منتہا سے ہے جو ہماری پوری زندگی کے لیے رہنما ثابت ہوتا ہے۔ اس منتہا کو بالعموم "خیرِاعلیٰ" کی حیثیت دی جاتی ہے"۔[1]

دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم اور قابلِ قدر شے وہ ہے جسے اہل یونان نے ناؤس (Nous) یا نوئٹک ناؤز (Noetic nous) کا لقب دیا ہے۔ جس کو عربی زبان میں نفس یا نفس ناطقہ کہتے ہیں۔ اسی کو بھارت میں آتما سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نفس کی مادّہ سے الگ اپنی مستقل ہستی ہے۔ اور کئی پہلوؤں سے کائنات کے اندر اسے فوقیت حاصل ہے۔ کائنات میں مرکزی حیثیت نفس کی ہے۔ کائنات کی ساری رعنائی و دلکشی کا ادراک نفس کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اسی کے سبب سے کائنات میں معنویت کی نمود ہے۔ ساری کائنات کا جوہر او خلاصہ نفس ناطقہ ہی ہے۔ کائنات میں جو چیزیں بھی دکھائی دیتی ہیں وہ نفس کے امکانات کے سوا اور کچھ نہیں۔ نفس ہی وہ چراغ ہے جس کی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جب اصل صورتِ حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ کائنات کی کوئی چیز بھی نفس انسانی کا مقصود نہیں ہو سکتی۔ نفس کا مقصود وہی ہوگا جو اس سے عظیم تر اور اعلیٰ ہو۔ اس لیے لازماً نفس انسانی کا مقصود و منتہیٰ ایک نفس مطلق (Supreme and absolute personality) ہی ہو سکتا ہے

ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ نفس ہر اعتبار سے اپنا مقصود خود ہے لیکن اس میں بعض ایسی دشواریاں ہیں جن کا حل ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اپنی تمام تر خوبیوں اور کمالات کے باوجود نفس قائم بالذات نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی خالق نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کامل ترین ذات (Perfect in his Personality) کی صورت میں ہوتا۔ اسے خود کا پورا علم ہوتا۔ اس کے لیے ضلالت اور گمراہی کے الفاظ بے معنی ہوتے اور اس کی تکمیل کا سرے

---

[1] A manual of ethics p 2

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اگر نفس کے مقصود کو ہم شخصیت (Personality) سے عاری تسلیم کریں تو اس صورت میں وہ نفس انسانی سے کمتر و فروتر ہوگا اور اسے کوئی بھی نفس کا مقصود قرار نہیں دے سکتا۔ اس لیے لازماً اپنا مقصود و منتہی کوئی ذات مطلق (Absolute personality) ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہ وہی ذات ہے جس کو دنیا خدا کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ خدا ہی درحقیقت تمام حقیقتوں کا سرچشمہ اور ہماری ہستی کا اصل مرکز و محور ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل کا تصور ذات مطلق کے بغیر ممکن نہیں اور نہ حیات اخروی پر ایمان لائے بغیر حیات کے تسلسل کا مسئلہ حل ہوتا ہے جس سے اخلاقی قدروں کے حصول کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

انسان کے لیے کسی ایسے اخلاقی نظام کا تصور جس کی بنیاد مادیت کے بجائے عالمگیر معنوی اصولوں پر قائم ہو کوئی ایسا تصور نہیں ہے جس سے ہماری زندگی مناسبت نہ رکھتی ہو۔ ہم میں ہر شخص اپنے ہر دنیوی معاملہ میں کوئی نہ کوئی معنوی نقطۂ نظر رکھنے پر مجبور ہے۔ انسان غیر شعوری طور پر محض میکانی انداز میں اپنا کوئی کام انجام نہیں دیتا۔ اس کے ہر عمل کے پیچھے اس کا علم و ارادہ کام کرتا ہے۔ مآل اندیشی اس کی فطرت میں داخل ہے۔ خالص مادیت کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے کہ کوئی اخلاقی اصولوں کے مطابق عمل کیوں کرے؟ اپنے قریبی مفاد کو نظر انداز کر کے دوسروں کے کام کوئی کیوں آئے؟ کمزوروں اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ ہم کیوں اختیار کریں؟ اس میں شبہ نہیں کہ مادیت کے علمبرداروں میں ایسے اشخاص ملتے ہیں جنھوں نے قربانیاں دی ہیں۔ مفلسوں، ناداروں اور مظلوموں کی حمایت میں وہ سرگرم کار رہے ہیں لیکن ان کا یہ طرز عمل ان کے بنیادی نظریہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یقیناً یہ مادیت کا نہیں مادیت سے ماورا کسی اور شئے کا اثر تھا جو ان کے نفس کے کسی گوشے میں چھپا رہا ہے۔

اخلاقی اقدار کا حصول انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اخلاق ہی وہ قابل قدر جوہر ہے جس کے ذریعہ سے روحانی مادی اور جمالیاتی (Aesthetic) قدروں میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسی کے ذریعہ سے معاشرے میں پائے جانے والے تضادات باہمی توافق میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اخلاق ہی وہ قوت ہے جس سے انسان کی زندگی اس حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے جو تغیرات سے بلند و بالا ہے۔ حقیقت کے ساتھ زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی یہی ہم آہنگی اور توافق ہے جس کو مفکرین نے حقیقی آزادی اور حصول صداقت سے تعبیر کیا ہے۔

مادہ پرست مادہ ہی کو اصل حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں جو کچھ بھی ہے وہ محض مادہ کی کارفرمائی ہے۔ مثلاً ان کے بعض لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ معاشی نظام کی ہیئت ہی میں انسانی زندگی کا سارا راز نہاں ہے۔ مذہب و اخلاق، تہذیب اور کلچر سب معاشی صورت حال کی پیداوار ہیں۔ درحقیقت حقائق کا یہ نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ مارکس اور مارکس کے متبعین کم از کم اگر نفسیات اور انتھروپولوجی ہی سے واقفیت رکھتے تو نفسیات انھیں بتاتی کہ پیداواری طاقتیں انسانی دماغ کے اعمال و افعال کی تشریح سے یکسر قاصر ہیں۔ انسانی ذہن ذرائع پیداوار کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انتھروپولوجی انھیں اس بات سے واقف کراتی کہ روح انسانی فریب محض نہیں ہے بلکہ انسانی کلچر کی پیدائش اور اس کی نشوونما میں درحقیقت اسی کی جلوہ گری ہے۔ مادی اسباب کو وہی کام میں لاتی اور ان سے مختلف اسالیب کی تشکیل کرتی ہے۔ مختلف اسالیب میں اسی کا اظہار ہوتا ہے۔

خود یہ کائنات صرف افادیت جس سے ہمارے مادی مفادات وابستہ ہوتے ہیں کی مظہر ہرگز نہیں ہے۔ اس کے اندر دوسرے اور قابل لحاظ اشارات بھی پائے جاتے ہیں جو افادیت سے برتر ہیں، جن کو نظر انداز کر کے کائنات کی جو توجیہ بھی کی جائے گی ناقص اور غلط ہوگی۔ کائنات معنی رکھتی ہے۔ زندگی معنویت کی حامل ہے۔ اس کی دریافت سے مادیت بالکل قاصر ہے۔ کائنات کے اندر نمایاں طور پر کسی بلند و برتر ذات کے علم و ارادہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ کائنات کے اندر کسی کے علم و ارادہ کے کارفرما ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں ساری کارفرمائی اخلاق کی ہے۔ علم و ارادہ کا ظہور ہمیشہ اخلاق کے ساتھ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں کہ انسان کی ضروریات اور کائنات کی فراہم کردہ اشیاء میں انتہائی گہرا ربط و تعلق ہے۔ جسم کو برقرار رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب انسان اپنے خارج میں موجود پاتا ہے۔ یہ بہتے دریا، یہ چشمے اور میدان، یہ مختلف قسم کے درخت اور جانور، یہ پھول پھل اور کھیتیاں انسان کے فطری مطالبات کا جواب ہیں۔ انھیں خالق کی رحمت کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اشیاء جنھیں ہم اپنے گردوپیش دیکھتے ہیں درحقیقت اخلاق خداوندی ہی کے زندہ مظاہر ہیں۔

اخلاقی کارفرمائی کی اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح تصویریں موجود ہیں لیکن انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کی طرف بہت کم توجہ دیتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بچے کی پرورش میں اصل دخل والدین یا اعزہ واقربا کی اس شفقت و محبت کا ہوتا ہے جو انھیں بچہ سے ہوتی ہے۔ یہ اخلاق کا کرشمہ ہے نہ کہ خالص مادیت کا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف اگر ہمیں ذوق جمال سے نوازا گیا ہے تو دوسری طرف کائنات کی ہر چیز کو حسن اور آراستگی بخشی گئی ہے۔ اس کو محض مادہ کی کرشمہ سازی قرار دے کر مطمئن ہو رہنا ذہنی و فکری خودکشی کے مرادف ہے۔ مارکس اور دوسرے مادہ پرست اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ زندگی کو مادیت پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک فائق تر شئے اپنے سے ادنیٰ درجے کی چیز کی تابع کیوں کر ہو سکتی ہے۔ زندگی شعور و احساس کی ایک آباد دنیا ہے جس کا سرچشمہ کوئی باشعور قادر مطلق ذات ہی ہو سکتی ہے اور صرف وہی ذات زندگی کا مقصود و منشا بھی قرار پا سکتی ہے۔ خدا کو اپنی زندگی سے الگ کر کے صرف یہی نہیں کہ انسان خدا کے حقوق کو نظر انداز کرتا ہے بلکہ اس کا یہ رویہ خود اس کے اپنے خلاف بھی ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنی حیثیت کو گرا دیتا ہے۔ اسس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے جسم کے تمام اعضاء ہاتھ، پیر وغیرہ لفظاً اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی حیثیت جو کچھ ہے وہ ہماری شخصیت کی نسبت سے ہے۔ اگر ہمارے دست و پا ہماری شخصیت کے تابع نہ ہوں تو ان کا وجود بے معنی ہو کر رہ جائے۔ نظام جسمانی میں مرکزی حیثیت ہماری شخصیت کو حاصل ہے۔ اس لیے ہمارے تمام اعضاء اپنی حیثیت کو باقی رکھنے کے لیے ہر لمحہ ہمارے دست نگر رہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اصل حیثیت کی تعیین خدا کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اس نسبت و تعلق کے بغیر ہماری حالت ایک ایسے ہاتھ پیر کی رہ جاتی ہے جس کو جسم سے کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا ہو۔ ایسے کٹے ہوئے ہاتھ پیر اور خاک کے ڈھیر میں کوئی بنیادی فرق باقی نہیں رہتا۔ انسان یہ تو سمجھتا ہے کہ ہاتھ یا پیر کا جسم سے کٹ کر الگ ہونا اس کے لیے ہلاکت ہے لیکن اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے وہ اس ہلاکت کو محسوس کرنے سے بالعموم قاصر رہتا ہے جس میں وہ خدا سے الگ ہو کر مبتلا ہوتا ہے۔

اخلاق انسانی کے لیے کوئی ناخوشگوار بوجھ ہرگز نہیں ہے۔ رنگ و بو پھولوں پر بوجھ نہیں پرندوں کے پر، پرندوں کے لیے کبھی بار ثابت نہیں ہوتے بلکہ یہ پر ان کے لیے باعث زینت بھی ہیں اور پرواز میں ان کے مددگار بھی۔ یہی حال پھولوں کے رنگ و بو اور آنکھوں کی پلکوں کا بھی ہے۔ انسانی زندگی میں بھی حقیقی حسن و خوبی اخلاق ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اخلاق سے عاری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو جانے کے بعد انسان کے پاس کوئی قابلِ قدر شے باقی نہیں رہتی۔ اخلاقی مطالبات ہماری فطرت کے اظہار کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔

اخلاق درحقیقت ایک عالمگیر اور آفاقی اصول کا نام ہے۔ وہی ہماری باطنی زندگی کا بھی قانون ہے۔ اخلاق ہی ہے جس کے ذریعہ سے انسان کی اندرونی زندگی میں توازن اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وہ آفاقی اصول ہے جس کا مشاہدہ ہم کائنات کے نظام میں بھی کرتے ہیں۔ کائنات کی ساری ہی چیزیں ایک صحیح اور فطری قانون کی تابع ہیں جس کے پیچھے خدا کا ارادہ کام کر رہا ہے۔ اس کا اعتراف کرنے پر آج بڑے سے بڑے مفکر بھی اپنے کو مجبور پا رہے ہیں۔ انھیں یہ ماننا پڑا ہے کہ یہ کائنات ایک مشین کے مشابہ ہونے کے بجائے ایک ذہن سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مادی تصورِ حیات انیسویں صدی عیسوی میں یورپ میں اپنے شباب پر تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں خود یورپ کے کتنے ہی مفکروں اور سائنسدانوں کو نئے انکشافات اور تحقیقات کے بعد اپنے نظریہ میں تبدیلی کرنی پڑی ہے۔ جے۔ ایس۔ ہالڈنے (J.S. Haldane) نے لکھا ہے کہ زندگی کے مسئلہ کو طبیعاتی اور کیمیاوی مسئلہ سمجھنا غلط ہے۔ زندگی اور انسان کی ذات (Personality) کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کی محض مادی تعبیر ممکن نہیں[1]۔

سائنس نے اب ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں بڑے بڑے سائنسداں یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ شے (Thing) سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ صرف عمل (Action) ہے یا وقوعات (Events) کی عبارت ہے[2]۔ اس سے اس بات کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ یہ کائنات اندھے بہرے مادہ کی تخلیق نہیں بلکہ اس کا منبعِ وجود کوئی ذہن و ارادہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں کائنات خلقِ رب کا مظہر ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کی دنیا میں اپنے رب کی اطاعت کرے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

---

[1] Prof J.S. Haldane in 'The Philosophical basis of Biology

[2] Quated by Iqbal in his lectures

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (ہود:۵۶) "بے شک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی کام عدل، حکمت اور حق کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اس نے حق اور خیر کے تحت کائنات کی تخلیق کی ہے۔ ہمارے ارادہ و اختیار سے بھی جو چیز مطلوب ہے وہ حق و صداقت کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ انسان کی فلاح اور اس کی کامیابی کا اصل انحصار اس کے ظاہر اور باطن کی درستی پر ہے۔ ظاہر و باطن کو خَلق و خُلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں: فلانٌ حسن الخُلق والخَلق۔ "فلاں کا باطن بھی اچھا ہے اور ظاہر بھی"۔ ظاہر کو اگر ہم آنکھ سے دیکھتے ہیں تو باطن یا روح کا ادراک بصیرت کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہو یا باطن ہر ایک اپنی ایک مخصوص ہیئت وصورت پر قائم ہوتا ہے۔ یہ صورت و ہیئت اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی۔ خُلق یا نفس کی ہیئت راسخہ ہی ہے جس سے اعمال و افعال کا صدور ہوتا ہے۔ اگر ہم سے اچھے اعمال صادر ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارا باطن بہتر ہے۔ اسی کو خُلقِ حَسَن سے تعبیر کرتے ہیں۔ آدمی کے رجحانات، مزاج اور ذوق سے اس کی باطنی صورت و ہیئت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کسی کے ذوق اور رجحان کو اس کے اخلاق و کردار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ رسکن (Raskin) نے غلط نہیں کہا ہے کہ ذوق حقیقت میں اخلاق کا کوئی جزو یا حصہ نہیں بلکہ ذوق ہی اصل اخلاق ہے۔ کسی کو جانچنے کے لیے پہلا اور آخری سوال جو اس سے کر سکتے ہیں وہ یہی کہ اسے کیا پسند ہے؟ آدمی کی پسند اور ناپسند اس کی غماز ہوتی ہے کہ خود وہ آدمی کیا ہے۔

اخلاقیات کے مطالعہ میں حق، حسن اور خیر (Truth beauty and Goodness) کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کا تعلق اصل میں ہمارے علم و احساس اور عمل سے ہے۔ اگر آدمی حق و صداقت کے دریافت کرنے میں ناکام رہا تو حقیقت میں وہ صحیح علم (True knowledge) سے محروم ہے۔ اس کی زندگی اگر ایک جمالیاتی تجربہ میں ڈھل نہ سکی تو اس کی احساسی (Feeling) دنیا ویران ہی رہی۔ اسی طرح اگر وہ "خیر" کو سمجھنے میں کامیابی حاصل نہ کر سکا تو عملی لحاظ سے وہ یکسر خاسر قرار پائے گا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ حق و صداقت (Reality) کیا ہے؟ وہ ان چیزوں کو اہمیت دیتا ہے جو حسن و خوبی کی حامل ہوں۔ اسی طرح وہ اس عمل کو اختیار کرنا چاہتا ہے جس میں خیر کا پہلو شامل ہو۔ عام مطالعہ میں صرف انسانی اعمال کا مطالعہ ہی اخلاقیات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے تحت کیا جاتا ہے ۔حق و صداقت کے حصول کو فلسفہ کا موضوع قرار دیا گیا ہے ۔اور حسن و خیر کو جمالیات کا موضوع سمجھا جاتا ہے ۔لیکن زندگی کی ان تینوں قدروں میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔مثال کے طور پر نیک عمل کو علم سے الگ نہیں کر سکتے ۔جو عمل صحیح علم کے مطابق نہ ہو وہ ضلالت ہے ۔سقراط نے کہا ہے :

Virtue. is a kind of knowledge

"نیکی علم ہی کی ایک قسم ہے"

سقراط کی مراد یہ ہے کہ اخلاقی فرائض کے نتائج اگر ہم پر پورے طور پر واضح ہوں تو لازماً ہم ان سے بے اعتنائی اختیار نہیں کر سکتے ۔غلط طرز عمل خود اپنے خلاف ایک سعی نامشکور ہے ۔اپنے خلاف کوئی اقدام کر کے کوئی اپنے تحفظ کا فریضہ کیونکر انجام دے سکتا ہے ۔

اخلاقیات سے جمالیات کو بھی الگ نہیں کر سکتے ۔ارسطو کے نظریہ کی رو سے اخلاقی زندگی خود اس کے اپنے جمالیاتی اوصاف کی بنا پر قابلِ قبول ہوتی ہے ۔

Only beauty is good

حُسن وجمال کی حامل شے ہی خیر ہے ۔

حُسن وجمال کا تعلق محض جسم ہی سے نہیں ہے ۔اخلاقی لحاظ سے بھی بعض چیزیں جمالیاتی (Morally excellent) ہوتی ہیں ۔کانٹ (Kant) کے الفاظ میں وہ ہیرے کی طرح خود اپنی روشنی سے چمک رہی ہوتی ہیں ۔وہ اس شے کی طرح ہوتی ہیں جس کی قدر و قیمت خود اس کے اپنے وجود سے قائم ہوتی ہے ۔

خوشی (Pleasure) کا بھی اخلاق سے گہرا رشتہ ہوتا ہے ۔صحیح اخلاقی طرز عمل سے سچی شادمانی حاصل ہوتی ہے ۔یہ شادمانی محض روحانی نہیں ہوتی بلکہ ذہنی، قلبی اور جمالیاتی بھی ہوتی ہے ۔اسی لیے کہا گیا ہے :

Virtue is its own reward and vice is its own punishment

"نیکی بذات خود اپنی جزا اور بدی بذات خود اپنی سزا ہوتی ہے ۔"

اخلاق ہی کے ذریعہ سے آدمی کی تکمیل ممکن ہوتی ہے ۔کمال کا حصول اخلاق کے بغیر ناممکن ہے ۔یہ اور اس طرح کے جن خیالات کا اظہار مفکر شخصیتوں نے کیا ہے ان کے ذریعہ سے درحقیقت زندگی ہی کے مختلف پہلوؤں اور قدروں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئی ہے۔ اخلاق کے ذریعہ سے زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔ اخلاق زندگی کو ایک فورم (Form) دیتا ہے۔ اخلاقی قدروں کا لحاظ زندگی کے تمام گوشوں میں مطلوب ہے۔

اخلاقیات میں فلاسفروں نے اپنا اولین فرض یہ سمجھا ہے کہ وہ زندگی کا حقیقی منتہا و مقصود دریافت کریں۔ افلاطون اور ارسطو سے لے کر اسپونزا (Spinoza)، کانٹ، ہیگل اور گرین (Green) تک سبھی نے یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ منتہا و مقصود کی تعیین کے بعد انسان کی ذمہ داری خود بخود متعین ہو جاتی ہے اور اس کا وجوب اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی منتہا و مقصود کے پس منظر میں انسان کی پوری زندگی اپنا ایک فورم اور شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مفکروں کو ان کی کاوش نے اس مقام تک پہنچا دیا ہے کہ وہ یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ زندگی کے مقصود و منتہا (Ultimate end) کا انسان کی موجودہ حیات سے اتنا قریبی رشتہ ہے کہ موجودہ حیات و وجود کو اس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ زندگی اسی میں داخل و شامل ہے۔ اخلاق کے فلاسفروں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو اس حد تک واضح اور لوگوں کی نگاہوں میں اسے اس درجہ عریاں کر دیں کہ عام انسانی شعور اسے اپنی گرفت میں لے سکے۔

جہاں تک ضابطہ یا قوانین کا مسئلہ ہے تو اس کے بارے میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ اخلاق و کردار جب بلند ہو جاتا ہے تو اخلاقی قوانین اور اصول انسان کے لیے اجنبی نہیں رہتے بلکہ وہ اس کے اپنے ہی شعور و احساس کی مرئی صورت ثابت ہوتے ہیں۔ آدمی جس چیز کو اپنے دل کی گہرائی میں پا رہا ہو اس کے اختیار کرنے کے لیے کسی خارجی قانون اور ضابطہ کے دباؤ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ایسے قانون اور اصولوں کی پاسداری کا مطالبہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی خود اپنے تئیں خیانت نہ کرے، وہ خود اپنے لیے سچا ہو:

To thine yourself be true

"تم اپنے تئیں سچے بنو۔"

اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی خود اپنی مخالفت ہے۔

انسانی معاشرہ سے انسان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اپنے سماج کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ مختلف نفوس و افراد سے مل کر سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ مثالی شخصیت کا کامل اظہار معاشرہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لیے سماجی ذمہ داریوں کو انسانی اخلاف سے الگ کر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں دیکھا جا سکتا۔ اخلاق کا اعلیٰ اور کامل تصور وہی ہے جس میں فرد کی بہبود اور اجتماعی لحاظ سے نوع انسانی کی فلاح کا راز پوشیدہ ہو۔ جس سے مشکلیں آسان ہوتی ہوں، الجھے ہوئے مسائل کا خاتمہ ہوتا ہو اور ہمارے دل و دماغ کو سکون و راحت حاصل ہوتی ہو۔ اور جس کے ذریعہ سے دنیا ظلم و فساد سے پاک ہو سکتی ہو۔ بریفو (Briffault) کا ذہن اس طرف گیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"مثالی اخلاقیات کی کیسی ہی عظیم الشان عمارت آپ تعمیر کریں اگر وہ باطل کو مٹا کر اس کی جگہ حق کو قائم کرنے سے قاصر ہے تو وہ بے معنی چیز ہے۔ اس اوپری عمارت کو اخلاقیات کی عمارت نہیں کہا جا سکتا۔"[۱]

اخلاق کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کے تذکرہ کے بعد یہ سوال باقی رہتا ہے کہ انسان اخلاقی نظام فکر و عمل کے لیے ایسے واضح ضوابط اور قوانین کہاں سے اخذ کرے جو سب کے لیے واجب الاطاعت ہوں۔ جس کے صحیح اور اعلیٰ نظام اخلاق ہونے میں کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔ انسانی علوم میں باضابطگی واضح ضابطہ کے بغیر ممکن نہیں اور نہ اس کے بغیر انسانی فکر کو انتشار و تلون سے بچایا جا سکتا ہے۔

اس سوال کا صحیح جواب صرف مذہب کے پاس ہے، انسانی فکر کے سامنے اخلاق کے فطری تقاضے تو ابھر سکتے ہیں لیکن مذہب کے تعاون کے بغیر مکمل اور قابل اعتماد ضابطۂ اخلاق ترتیب دینے سے وہ یکسر قاصر ہے۔ مذہب کے علاوہ دوسرے ذرائع خواہ وہ نفسیات و وجدان ہو یا تجربات و احساسات اصل ماخذ کے صرف مددگار ہو سکتے ہیں۔ اصل ماخذ کی حیثیت ان کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ محض جزوی صداقتوں کے علم سے ایک اعلیٰ اور محکم نظام اخلاق کی تشکیل کیونکر ممکن ہو سکتی ہے۔ ایک قطعی اور واجب الاطاعت قانون کی ضرورت کا احساس تو کانٹ کو بھی ہوا ہے لیکن وہ اس کی کوئی واضح تشریح کرنے میں ناکام نظر آتا ہے۔

اخلاق کے سلسلے میں خیر و شر کے صحیح تصور کا سوال سامنے آتا ہے۔ لیکن اس کے حل کرنے میں ہمارا تجرباتی اور وجدانی علم ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ عقل اس معاملہ میں دور تک ہمارا ساتھ نہیں دیتی۔ اخلاق کی پشتیبان قوت اور داعیات و محرکات کے بارے میں انسانی فکر نے جو چیزیں تجویز کی ہیں ان کی نفی نہیں کی جا سکتی لیکن مذہب کی رہنمائی نہ ہو تو ان چیزوں کی حیثیت واضح نہیں ہوتی اور نہ انھیں کوئی محکم بنیاد میسر آتی ہے۔

---

[۱] The making of humanity

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سلسلے میں جب ہم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں جو کامل، مستند اور خدا کی طرف سے آیا ہوا آخری دین ہے تو ہمیں ان سارے ہی سوالات کا کافی و شافی جواب مل جاتا ہے جو اخلاقیات کے مطالعہ میں ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہاں ہم کو خیر و شر، نیک و بد، صحیح اور غلط کا واضح علم حاصل ہوتا ہے۔ یہاں صاف الفاظ میں بتا دیا گیا ہے کہ علم کا اصل ماخذ خدا کی ہدایت اور کتاب الٰہی ہے۔ خدا نے جو قانون اخلاق عطا فرمایا ہے اس کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے یہی بنیاد کافی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ انسان کے لیے جس منتہا و مقصود کی ضرورت ہے وہ خدا کی ذات اور رضائے الٰہی کے علاوہ کوئی دوسری شے نہیں ہو سکتی۔ خدا کی ذات ہی وہ نفس اعلیٰ اور کامل ترین ذات ہے جو نفس انسانی کا ملجا و ماویٰ قرار پاتی ہے۔ اگر خدا کی ہستی کے سوا کسی اور شے کو ہم متنائے حیات اور غایت ہستی قرار دیتے ہیں تو یہ حق کے خلاف اور نفس انسانی پر ظلم ہوگا۔ نفس انسانی کو جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے دوسری تمام اشیاء کے مقابلہ میں فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اس لیے اس کا مقصود کوئی ایسی چیز ہرگز نہیں ہو سکتی جو شخصیت (Personality) کے وصف سے عاری ہو۔ اس لیے لازمی طور پر انسان کے جذبات و احساسات اور اس کی سعی و جہد کا رخ خدا ہی کی طرف ہونا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تارے آسمان میں دیر تک چمکتے ہیں۔ چاند ہماری تاریک راتوں کو منور کرتا ہے اور سورج سے روشنی و تمازت حاصل ہوتی ہے، لیکن ہمارے دل کے نہاں خانے کے لیے ان کے پاس کوئی روشنی نہیں ہے اور نہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں چھپی امنگوں کے لیے ان کے پاس کوئی گرمی ہے۔ کائنات میں جو بھی ہے خدا کا دست نگر اور محتاج ہے اس لیے اس کے سوا کوئی نہیں جو ہماری زندگی اور ہمارے تگ و دو کا اصل محور و مرکز قرار پا سکے۔

انسان کے لیے واضح فلاح اور خیر کی بات یہ ہے کہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جس سے وہ دنیا میں دوچار ہے۔ جو طرزِ عمل اس بھلائی کے حصول میں مددگار ہو وہی درست ہے اور جو طرزِ عمل اس بھلائی کے حصول میں مددگار نہ ہو سکے بلکہ اس کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو وہ غلط ہے۔ خدا کی ہدایت ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ خدا کی محبت، اس کی رضا اور خوشنودی کی طلب اور اس کی ناراضی سے بچنے کی فکر اخلاق کی پابندیوں اور بُرے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک ہے۔ خدا شناس افراد سے مل کر جو سوسائٹی اور صالح ریاست وجود میں آتی ہے جس کی تشکیل خدا کے دئیے ہوئے قانون کی روشنی میں ہوتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اس کے اندر خود خدائی نظامِ اخلاق کے قیام کی طاقت ہوتی ہے۔ پھر قانون کی پابندی پر آمادہ کرنے کے لیے فرض شناسی کا احساس بھی پورے طور پر کام کرنے لگتا ہے اور حق سے محبت اور باطل سے نفرت کا جذبہ بھی اس سلسلہ میں محرک کا کام کرتا ہے۔

اسلام جزوی سچائیوں کی نفی ہرگز نہیں کرتا وہ سب کی سب اسلام کے اخلاقی نظام میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ منتشر اجزا کی شکل میں یا ناقص حالتوں میں موجود ہوں اسلام انھیں محکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسلام حصولِ کمال کی خواہش کو جسے فکرِ انسانی کی نظر میں ایک اخلاقی محرک کی حیثیت حاصل ہے رد نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام نے اس کی اہمیت کی تصدیق کی ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِیْ	اپنے خدائے برتر کے نام کی تسبیح کرو
خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ	جس نے خاکہ بنایا تو تناسب بھی قائم کیا
فَهَدٰى ۝ وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ	اور جس نے مقدر کیا تو رہنمائی بھی فرمائی اور
الْمَرْعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝	جس نے سبزہ اگایا تو اُسے گھنا اور سرسبز و
(۸۸: ۱-۵)	شاداب بھی کیا۔

مطلب یہ ہے کہ خدا نے پیدا ہی نہیں کیا، اچھی ساخت بھی عطا کی۔ پھر اس نے اچھی ساخت اور حُسنِ فطرت ہی نہیں بخشی بلکہ مقصود و غایت کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زمین میں سبزہ اور گھاس اُگاتا ہے اور اس میں جو صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں انھیں ابھارنے اور ترقی دینے کا نظم بھی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ننھے ننھے انکھوے بڑھ کر نہایت گھنے، شاداب اور خوشنما درخت ہو جاتے ہیں۔ اس قانون سے انسان کی زندگی الگ نہیں ہے۔ خدا نے انسان کو صرف زندگی ہی نہیں عطا کی بلکہ وجود دے کر اس نے اسے اس کے مقصدِ وجود کا علم بھی بخشا۔ وہ انسان کو اس راہ کی طرف رہنمائی فرماتا ہے جس پر چل کر وہ اپنے حقیقی مقصدِ حیات کو پا سکتا ہے اور اپنی زندگی کو درجۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اسلام ہماری زندگی کے نازک سے نازک پہلوؤں کا محافظ ہی نہیں ہے بلکہ وہ ان کو درجۂ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کو پامال کر دے اور تکمیل سے اسے محروم رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ	کامیاب ہو گیا جس نے اُسے (اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خَابَ مَنْ دَسّٰهَا — نفس کو نکھارا۔ اور ناکام ہوا جس نے اسے دبایا اور خراب کیا۔ (۹۱ : ۹-۱۰)

انسان کی تکمیل حقیقت میں اپنے رب کی طرف بڑھنے ہی سے ہوتی ہے، خدا سے بے نیاز و بے گانہ ہو کر انسان پستی میں جا گرتا ہے اور کامیابی کے بلند مرتبے پر پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اسلام نے اس کی پوری وضاحت کردی ہے کہ انسان اپنی تکمیل کے لیے دنیا کے آزمائشی دور میں کون سا طرزِ عمل اختیار کرے۔ اس سلسلہ میں اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس سے فرد ہی نہیں، جماعت، قوم اور پوری انسانیت ترقی کی طرف بڑھ سکتی ہے اور لوگ ایک دوسرے کی تکمیل میں مزاحم ہونے کے بجائے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہاں اس خوشی (Pleasure) کی بھی نفی نہیں کی گئی ہے جس کا ذکر اخلاق کے مفکرین کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ خدا کی رضا کی طلب اور اس کے لیے سعی و جہد اور اس کے دئے ہوئے قانون کی پیروی بذاتِ خود سب سے بڑی خوشی کی چیز ہے۔ اسلام ذہن و دماغ اور دل کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ وہ انسان کے سارے ہی جذبات اور اس کی خواہشات کا احترام کرتا ہے۔ البتہ وہ اسی خوشی کو سندِ جواز عطا کرتا ہے جو فطری اور احکامِ خدا کے تحت ہو۔ اخلاقی فرائض کی انجام دہی میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے اسے تو اسلام نے دین و ایمان کی علامت تک قرار دیا ہے۔ چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اِذْ سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ — جب تمہیں اپنے اچھے کام سے خوشی ہو اور اپنے بُرے کام سے تکلیف اور افسوس ہو تو تم مومن ہو۔ (احمد)

خوشی خواہ ذہنی ہو یا روحانی اور جمالیاتی اگر اس خوشی اور دینی قدروں کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو تو وہ معتبر ہے۔ اسلامی نظامِ حیات میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فرد کی خوشی اور جماعت اور پوری انسانیت کی خوشیوں کے درمیان کوئی تضاد و تصادم پیدا نہ ہو۔

خدائی ہدایت کے ذریعہ سے جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہی اصل علم ہے۔ دوسرے علوم خواہ وہ تجرباتی ہوں یا وجدانی ان کی حیثیت اصل علم کے شواہد کی ہے، اخلاقیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ قوانینِ حیات، عقل و وجدان اور انسانی کے تجربات سب کے سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدائی ہدایت کے حق اور خیر ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اصل معیار خدا کی ہدایت ہے۔ حکماء کی تجویز کردہ چیزوں کی اس سے نفی نہیں ہوتی بلکہ اس سے ان کی تصحیح و تکمیل ہوتی ہے۔ ان میں سے اگر کوئی چیز غلط حدود میں پہنچ گئی ہے تو خدا کی ہدایت میں اسے ایک جامع نظام کے اندر اس کے اپنے ٹھیک مقام پر رکھا گیا ہے۔

یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ اسلام میں اخلاق صرف جنت اور دوزخ کے تصور پر مبنی ہے۔ جنت اور دوزخ کا تصور اخلاق کی اصل اساس نہیں ہیں بلکہ یہ اخلاق کے آخری نتائج ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہا جائے کہ کسی کا مال ہڑپ کرو گے تو جیل جانا پڑے گا تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کام کی برائی قید خانہ پر مبنی ہے۔ خود اس فعل میں کوئی برائی نہیں۔ اسی طرح اگر کسی سے کہا جائے کہ سچائی اختیار کرنے والے کو سوسائٹی میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہو سکتا ہے کہ سچائی کی اساس مقامِ عزت کا حصول ہے، سچائی اپنے اندر کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔

قرآن حکیم نے خیر و شر کا ایسا نظریہ پیش کیا ہے جس کی بلندیوں کا تصور بھی عام ذہن نہیں کر سکتا۔ قرآن خیر کو "معروف" کہتا ہے یعنی اس کے نزدیک خیر وہ ہے جس سے انسان کی فطرت مانوس ہے۔ جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جسے وہ پہچانتی ہے۔ شر کو قرآن "منکر" کہتا ہے، یعنی شر اس کے نزدیک وہ ہے جس سے انسان کی فطرت ابا کرتی ہے۔ جو انسان فطرت کے لیے اجنبی ہے۔ جس کو وہ جانتی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام میں نیکی و بدی کی اساس انسانی فطرت پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک نیکی یہ ہے کہ فطرت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلا جائے۔ مطلوب یہ ہے کہ آدمی ترقی کر کے اس مرتبے کو پالے جہاں دین کی کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف نظر نہ آئے۔ سب کچھ اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہو۔ جنت کی تعریف میں قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ (۴۱ : ۳۱)	تمہارے لیے وہاں وہ سبھی کچھ ہے جو تمہارا جی چاہے اور وہاں تمہارے لیے وہ سبھی کچھ ہے جس کی طلب تمہارے اندر ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی نقطۂ نظر سے فطرت کے خلاف عمل کرنے کا نام بدی ہے اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ آدمی تنزل اور گراوٹ کے اس مقام پر پہنچ جاتا جہاں کوئی چیز مرغوب و پسندیدہ نہ پائی جائے۔ جو کچھ بھی ہو اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ جہنم ایک ایسا ہی مقام ہے جس تک آدمی کو اس کی اخلاقی گراوٹ ہی پہنچاتی ہے۔ اس سے معلوم ہو کہ اخلاق کی اصل بنیاد انسان کی اپنی فطرت کی پہچان اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اخلاق کوئی خارجی شے نہیں بلکہ وہ فطرت انسانی کا صحیح اظہار ہے۔ انسان اگر اپنے حقیقی جذبات واحساسات کو پہچان لے تو اخلاقی تقاضے اس کے اپنے دل کی امنگوں سے مختلف کوئی چیز نہیں ہیں۔ جب تک انسان اپنی حقیقی فطرت سے آشنا نہیں ہوتا وہ برائی سے خواہ بچ بھی جائے مگر اس کے دل و دماغ بدستور گنہگار رہیں گے۔

آدمی کی جیسی شخصیت ہوتی ہے اس سے اعمال کا صدور بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ کسی عمل کے پیچھے صرف جبلی تحریک (Motive) ہی کا دخل نہیں ہوتا اس میں اس کا ذہن و فکر اور اس کی عقل بھی کام کرتی ہے۔ اس کے پیچھے اس کے آئیڈیل اور مقصدِ حیات کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے جس کو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس پہلو سے اخلاق و کردار زندگی کا کچھ حصہ یا ارنلڈ (Mothew Arnald) کے خیال کے مطابق تین چوتھائی ہی نہیں ہوتا بلکہ فطری طور پر وہ اس کی پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بعض ایسی غیبی چیزیں بھی اخلاق کے لیے محرکات کا کام کرتی ہیں جن کا احساس عام طور پر لوگوں کو نہیں ہوتا۔ آدمی جب اپنی زندگی کو عالم غیب و بسیط سے جو عالم حقیقت ہے ہم آہنگ کرلیتا ہے تو خدا کی طرف سے اسے تائید و مدد حاصل ہونے لگتی ہے۔ اسے علم و حکمت سے نوازا جاتا ہے۔ اسے طمانینت اور سکینت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتے بھی اس کے دل میں نیک خیالات واحساسات القا کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ خدا کی ایک اعلیٰ اور معصوم مخلوق کی معیت بھی اسے حاصل ہے۔

انسانی حیات میں اخلاق کا نمایاں اظہار حقوق کی ادائیگی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسان پر سب سے پہلا اور سب سے بڑا حق اس کے خالق و مالک خدا کا ہے۔ خدا کے حقوق کی ادائیگی میں اس کی عبادت، پرستش، اطاعت وغیرہ ساری ہی چیزیں داخل ہیں۔ خدا کے بعد بندگان خدا کے حقوق ہیں جن سے اس کے مختلف قسم کے تعلقات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے ہیں۔ خدا کے بندوں میں سب سے نمایاں حق والدین کا ہوتا ہے کیونکہ والدین سے انسان کا تعلق انتہائی قریبی اور گہرا ہوتا ہے۔ پھر درجہ بدرجہ دوسرے لوگوں کے حقوق سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ تفصیل قرآن کی اس آیت میں ملتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ	اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی
شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	چیز کو شریک نہ کرو، والدین، قرابت داروں
وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ	یتیموں، مسکینوں، پڑوسی رشتہ دار، اجنبی
الْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى	ہمسایہ، پہلو کے ساتھی، مسافر اور جو
وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ	تمہارے زیر دست ہوں سب کے
بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا	ساتھ نیک سلوک کرو۔ بلاشبہ اللہ کسی
مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ	ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو مغرور
لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا	اور ڈینگیں مارتا ہو۔
فَخُوْرًا ۝ (۴ : ۲۶)	

اس آیت میں والدین، اعزہ اور دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیتے ہوئے خدا کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس طرح والدین، رشتہ داروں وغیرہ کے ساتھ نیک برتاؤ انسان کے لیے ایک اخلاقی اور فطری بات ہے ٹھیک اسی طرح خدا کی اطاعت و بندگی کا مطالبہ بھی ایک فطری مطالبہ ہے جس کا اخلاق انسانی سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں طرح کے حقوق کی ادائیگی میں ایک ہی بنیادی اخلاقی اصول کام کرتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے صرفِ نظر کرنا اس بنیادی اصول کی تردید کے ہم معنی ہے اور اس سے انسان خود اپنے اخلاق و کردار کو بھی صدمہ پہنچاتا ہے۔ بنیادی اخلاقی اصول زندگی کے تمام ہی شعبوں میں کام کرتا ہے خواہ زندگی کا سیاسی شعبہ ہو یا معاشی۔

ان تفصیلات کی روشنی میں اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاقی فرائض کی ادائیگی محض کسی خارجی قانون کی پیروی کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ آدمی کا کوئی ایسا ایثار ہے جو کسی اجنبی (Alien) طاقت کے لیے ہو بلکہ یہ تو ان اجزائے حیات کی فطرت کے ساتھ ہمارے محض ہم آہنگ ہو جانے کا اظہار ہے جن سے انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ چنانچہ افلاطون (Plato) نے کہا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Virtue will be a kind of health and beauty and good habit of the soul; and vice will be a Discease and Deformity and Sickness of it.

"نیکی کو صحت اور حسن کی ایک قسم اور روح کی ایک اچھی فطرت کہا جائے گا اور گناہ کو مرض اور روح کا بگاڑ اور اس کی بیماری قرار دیں گے"۔[1]

سچ ہے، نیکی کی تلاش اور گناہوں سے اجتناب بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی صحت کا طالب اور بیماری سے بچنے کی کوشش کر رہو۔

---

[1] G. Lowes Dickinson

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے قلم کا ایک تازہ شاہکار

تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات

جس میں بڑے واضح اور متعین انداز سے انسانی تہذیب و تمدن پر اسلام کے عظیم ناقابل فراموش احسانات اور دور رس و دیرپا نقوش و اثرات سے پوری علمی و تاریخی دیانت، فکری و تحقیقی متانت اور ایمانی حکمت و فراست کے ساتھ بحث کی گئی ہے، اور ایک پھیلے ہوئے تاریخی موضوع کو دس نکات میں سمیٹ کر گویا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دنیا کو اسلام کے عظیم عطیات میں عظمت انسانی اور عورتوں کے حقوق کی بحالی، توحید کے عالمی اثرات، علم و عقل کی ہمت افزائی، عالمی اخوت و مساوات، دین و دنیا کی وحدت، اور ایک صالح عالمی تمدن پر خصوصی روشنی ڈالی گئی ہے۔

- ایک تاریخی جائزہ جو عصری مشکلات و مسائل کا اسلامی حل ہے۔
- دنیا کے ایک بڑے مذہب (اسلام) کے عالمگیر اثرات کی نشاندہی جو مسلمانوں اور غیر مسلموں سب کے لیے قابل غور و فکر ہے
- ملت اسلامیہ کے لیے لمحۂ فکریہ اور دنیا کی رہنمائی کے لیے سرگرم عمل ہونے کی مخلصانہ دعوت۔
- انسانیت کے حال و مستقبل اور اسلام سے تعلق رکھنے والے ہر مخلص اور جویائے حق انسان کے لیے ایک نایاب تحفہ!

اعلیٰ طباعت و کتابت، قیمت اعلیٰ ایڈیشن -/۱۵، عام ایڈیشن -/۱۰، عربی -/۱۶

انگریزی زیر طبع، صرف قیمت پیشگی بھیجنے والوں کو کتاب رجسٹرڈ بھیجی جائے گی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹، ندوۃ العلماء لکھنو

© rasailojaraid.com